دینی سکالر شامل ہوئے تھے۔ مندوبین نے اسرائیل کے خلاف خودکش حملوں کے حق میں فتویٰ دیتے ہوئے انہیں قران کی رو سے جائز قرار دیا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ خودکش حملے ایک ایسا تزویراتی ہتھیار ہیں جو صیہونیت سے نمٹنے کے لیے اپنے پیروکاروں کو ہر لحظہ سرگرم عمل رکھتا ہے۔

مذہب کو عربوں کی سیاسی ضروریات کے تحت استعمال کرنا مشرق وسطیٰ میں خطرے کی ایک بہت بڑی علامت ہے۔ حماس اور فلسطینی اسلامی جہاد نے بہت احتیاط اور بڑے منظم طریقے سے تسلسل کے ساتھ اپنا پیغام ملک میں اور بیرونِ ملک اپنے مخصوص مخاطبین کو مذہبی دعویٰ پارسائی کے ساتھ پہنچایا ہے، جو قوم پرستی کی ہی ایک شکل ہے۔ قومیت پرستی کے جذبے کو اب مذہبی تقدس کا رنگ دے دیا گیا ہے اور اسلام کی ایسی تعبیر پیش کی گئی ہے جس سے اسرائیل کے وجود کی نفی ہوتی ہے اور دہشت گردوں کے موقف کو تقویت ملتی ہے۔

فلسطین کی مزاحمتی تحریک کو جہاد کے قالب میں منتقل کرنا کوئی پسندیدہ عمل نہیں۔ فلسطین کا تنازعہ خالص ایک سیاسی تنازعہ ہے اور اسے اسی تناظر میں حل ہونا چاہیے۔ اس مسئلہ کو مذہبی رنگ دے کر اسرائیل کے خلاف مسلمانوں کے جذبات کو ابھارنا، انصاف کے تقاضوں کے منافی ہے۔ حماس اور پی آئی جے نے دہشت گردی کو ہوا دینے کا جو سلسلہ شروع کر رکھا ہے، اس سے علاقائی سطح پر اور عالمی سطح پر امن کی قوتوں کو دھچکا لگا ہے۔ امریکہ نے دہشت گردی کے خلاف جو جنگ بپا کر رکھی ہے، اسے مشرق وسطیٰ میں بھی جاری رہنا چاہیے اور جو قوتیں اس خطے کے امن کو تہ و بالا کر رہی ہیں، ان کے خلاف تادیبی کارروائی کی جانی چاہیے۔

[یوناہ الیگزینڈر پوتومیک انسٹی ٹیوٹ فار پالیسی اسٹڈیز کے "بین الجامعات مرکز برائے مطالعات دہشت گردی" کے ڈائریکٹر ہیں۔ آپ درج ذیل کتاب سمیت بین الاقوامی تعلقات اور دہشت گردی کے موضوع پر تقریباً ۹۰ کتابوں کے مصنف بھی ہیں: *Combating Terrorism: Strategies of Ten Countries*, University of Michigon Press, 2002.]

قتل بذریعہ خودکشی —— تاریخ اسلام سے ماخوذ واقعات

مصنف: کیرن انڈریالو

ترجمہ: پروفیسر نیاز عرفان*

فلسطینی خودکش بم بازوں کے ہاتھوں عالمی تجارتی مرکز کی تباہی اور لبنان میں امریکی اہداف اور اسرائیلی تنصیبات کے خلاف کمانڈو کارروائیوں کے نتیجے میں، اب ہم ''قتل بذریعہ خودکشی'' کے مظہر سے بخوبی واقف ہو چکے ہیں۔ اگرچہ ایسی تنظیموں میں جو سیاسی تشدد کے لیے ذاتی قربانی کی خاطر اپنے ارکان کی بھرتی، تربیت اور تفویض کار میں ملوث ہیں، مسلمانوں کے گروہوں کی نمائندگی نمایاں ہے، تاہم اس کام میں وہ تنہا نہیں ہیں۔ مثال کے طور پر سری لنکا میں ہندو تنظیم تامل ٹائیگرز نے ایسی ہی خودکش کارروائیوں کے ذریعے بھارتی وزیراعظم راجیو گاندھی اور سری لنکا کے صدر رانا سنگھے پریما داسا سمیت متعدد سر برآوردہ سیاست دانوں کو قتل کیا ہے۔

اس قسم کی کارروائیوں میں خودکشی بہت نمایاں عنصر ہے جس کا تعلق کسی گروہ اور اس کے پروگرام سے ہوتا ہے اور اس کا محرک، منصوبہ بندی اور اس پر عمل درآمد اسی گروہ کے تنظیمی ڈھانچے کے تحت ہوتا ہے۔ اپنی زندگی کے خاتمے کا انتہائی ذاتی، انفرادی اور جرأت مندانہ عمل متشددانہ شناخت کی طالب نظریاتی تحریک کے طبل جنگ کی تال پر آگے بڑھتا ہے۔ اگرچہ شہید اور تحریک کے مابین اشتراک عملاً بے جوڑ نظر آتا ہے، تاہم یہ انتہائی صورتوں میں وقوع پذیر ہوتا ہے۔ اور اس کی کامیابی کی شرائط ضروری نہیں کہ عمومی سماجی عمل کی ضروریات سے مطابقت رکھتی ہوں۔ قتل بذریعہ خودکشی کرنے والے کے عمل میں اپنی مرضی بھی شامل ہوتی ہے اور اس تحریک کی مرضی بھی شامل ہوتی ہے جس سے اس کا تعلق ہوتا ہے۔ شہادت کے لیے ضروری ہے کہ شہید اس کا انتخاب آزادانہ کرے لیکن اس کا مطمح نظر اپنی تنظیم کے اہداف کا حصول بھی ہوتا

---

* Karin Andriolo, "Murder by Suicide: Epicodes from Muslim History", *American Anthropologist*, Washington, Sep-2002, pp. 736-742.

ہے۔ دراصل جب تنظیم کی مرضی شہید کی اپنی مرضی بن جاتی ہے تو یہ فعل سرزد ہوتا ہے۔

ذیل میں تاریخ اسلام سے لی گئی تین مثالوں سے قتل بذریعہ خودکشی کے مرتکب ’’شہیدوں‘‘ اور ان کی تنظیموں کے اہداف کی یکجائی اس عمل کی تصویر کشی اور اس کے مذہبی عباداتی پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔

حشیشین (ASSASSINS)

قتل بذریعہ خودکشی کے عمل کی ایک بدنام زمانہ مثال ’’نظاری ریاست‘‘ میں ملتی ہے جو گیارہویں سے تیرہویں صدی عیسوی کے دوران شام اور ایران میں قائم پہاڑی قلعوں پر مشتمل تھی جو آپس میں کسی حد تک مربوط تھے۔ شامی حشیشین کے بارے میں حقائق اور افسانے یورپ میں مشرق وسطیٰ سے واپس جانے والے صلیبی سپاہیوں کے ذریعے پہنچے اور وہاں یہ اصطلاح رائج ہوگئی۔ مارکو پولو جیسے ان سیاحوں نے، جنہوں نے مشرق بعید کے سفر اختیار کیے، ایرانی نظاریوں کی اس بنتی ہوئی تصویر میں مقامی طور پر رائج قصے کہانیوں سے مزید رنگ بھرا۔ مسلمانوں کے ذرائع سے حاصل شدہ معلومات کو شامل کر کے جدید دور کے محققین نے مستند تاریخی حقائق کو ظن وتخمین کی آلائش سے پاک کر دیا ہے۔ زیرنظر تحریر میں ان دونوں ذرائع سے استفادہ کیا گیا ہے۔

نظاری ریاست میں شیعوں کی ایک اقلیم تھی اور یہ ان چند ایک مقامات میں سے تھی جہاں ان کو سیاسی اقتدار حاصل ہوا۔ مشرق وسطیٰ میں سُنی حکومتوں کے خاتمے کے لیے (شیعہ) نوجوانوں کا ایک لشکر تیار کر کے ان کی تربیت کی جاتی تھی اور ان کو سنی مقتدرہ میں سے سربرآوردہ حکام کو قتل کرنے کا حکم دیا جاتا تھا۔ عموماً ان نوجوانوں کا تعلق دیہی علاقے سے ہوتا تھا جنہیں اسلحہ کے استعمال کی وسیع پیمانے پر تربیت دینے کی غرض سے ایک قلعے میں لے جایا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ وہاں مختلف زبانیں اور وہ معلومات اور مہارتیں بھی سکھائی جاتی تھیں جن کی مدد سے بعدازاں انہیں مختلف بھیس بدلنے میں سہولت ہوسکتی تھی تا کہ وہ پکڑے نہ جاسکیں۔ ان کا مشن یہ ہوتا تھا کہ وہ اعلیٰ مرتبے پر فائز اور ہر قسم کے حفاظتی انتظامات میں رہنے والی اپنی شکار شخصیت سے اتنی قربت حاصل کرلیں تا کہ اسے بہ آسانی خنجر کے وار سے قتل کرسکیں۔ اکثر ان کے مشن میں یہ بات بھی شامل ہوتی تھی کہ وہ دھیرے دھیرے اپنے ہدف شخص سے ہم رازی کے مرتبے پر

فائز ہو جائیں اور بعض اوقات ایک ہی شکار کے پیچھے کئی قاتلوں کو لگا دیا جاتا تھا۔ حشیشین اپنی زندگی کی بھی پرواہ نہیں کرتے تھے، اور اپنے شکار کے ساتھ مر جانے کو باعث افتخار سمجھتے تھے۔

اپنے دو سو سال سے زائد عہدِ حکومت کے دوران نظاریوں نے اپنے واضح اور غیر مبدل اہداف اور تزاویر کو جاری رکھا۔ ان کی ترجیح یہ ہوتی تھی کہ مضبوط اور محفوظ صاحب اختیار (سنی) شخصیت کو میدان جنگ کی بجائے تنہا ختم کر دیا جائے۔ کیونکہ جنگ کے لیے بڑی طاقت کی حامل حکومت کی ضرورت ہوتی ہے۔ حشیشین کے ''عمل جراحی'' کے ذریعے (سنی) قائدین کا خاتمہ کیا جاتا اور افراتفری، خوف و ہراس کی فضا اور تعلقات میں تبدیلی پیدا کی جاتی۔ ان کے ارادے بہت بلند تھے، وہ دو خلفاء اور متعدد وزراء، سلاطین، امراء، منتظمین، منصفین اور علمائے دین کو قتل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ البتہ وہ اپنے سب سے بلند مرتبہ شکار صلاح الدین ایوبی کو ٹھکانے لگانے میں کامیاب نہ ہو سکے جو ان کے دو قاتلانہ حملوں میں بچ نکلے۔ البتہ صلاح الدین ایوبی نے غالباً اس بات کا شبہ ہو جانے پر کہ ان کے دو نہایت قابل اعتماد محافظ دراصل ان کے قتل پر مامور حشیشین ہیں، شامی نظاریوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ سے احتراز کرنا مناسب جانا۔ (یہ عجیب وغریب قصہ صحیح معلوم نہیں ہوتا، البتہ ان پر دو حملوں کی بات سچ ہے۔)

حشیشین نے، جن کو بعض روایات کی رو سے فدائین بھی کہا جاتا ہے، تکنیکی اور نفسیاتی لحاظ سے اپنے طریقہ واردات کو بتدریج بہت موثر بنا لیا تھا۔ ایک ایسے خودکش قاتل کا جو اپنی بقا کی امید یا منصوبے کی پریشانی میں مبتلا نہیں ہوتا، اپنے مفوضہ فریضے کی ادائیگی میں کامیابی کا زیادہ امکان ہوتا ہے کیونکہ وہ اس میں زیادہ مہارت، جوش و جذبے اور تنوع و جدت سے کام لیتا ہے۔ علاوہ ازیں حشیشین کی اپنی زندگی سے بے اعتنائی کی بنا پر اس امر کا کوئی امکان باقی نہیں رہتا تھا کہ کوئی شخص ان پر دھمکیوں سے یا لالچ سے اثر انداز ہو سکتا تھا۔ یقینی موت انہیں ناقابل رسائی بنا دیتی تھی۔ لوگ ان سے خوفزدہ تو ہوتے تھے لیکن ان سے بچنے کی کوئی صورت نہ پاتے تھے۔

نظاریوں کا تعلق شیعوں کے اسماعیلی ذیلی اقلیتی فرقے سے تھا۔ وہ اپنے اہداف ہزار سالہ پروگرام کی زبان میں بیان کرتے تھے جس کا مطمع نظر سنی حاکمیت، جسے وہ باطل قرار دیتے تھے، کا خاتمہ اور (بزعم خود) عدل و انصاف کی بالادستی تھا۔ وہ اپنے اخلاقی و دینی مشن کی نجابت کے تصور کو اپنے نوجوانوں کے

ذہن میں جاگزیں کرتے تھے اور رسوم کی ادائیگی کے ذریعے اس کو مہمیز دیتے رہتے تھے۔ قتل کے عمل کو بھی ایک رسم کا روپ دے دیا گیا تھا جسے تقریباً تقدیس کا درجہ حاصل ہو گیا تھا۔ اس عمل میں صرف خنجر کا استعمال کیا جاتا تھا۔ اگرچہ بعض اوقات قتل کے دیگر ذرائع کارکردگی میں بہتر ثابت ہو سکتے تھے۔ یہ وہ خاص خنجر ہوتا تھا جو نظاری رہنما منتخب کردہ شخص کو مشن کی انجام دہی کی خاطر بھیجنے کے موقع پر ایک خاص رسم کی ادائیگی کے بعد حوالے کرتا تھا۔

ان تمام کارروائیوں کے بعد بھی نظاری تحریک سنی اقتدار کا خاتمہ نہ کر سکی اور بعد میں، تیرہویں صدی میں منگولوں نے مشرق وسطیٰ کے نقشے کو نئے سرے سے ترتیب دیا۔ تاہم ان کے سیاسی تشدد کی منصوبہ بندی، نظم وضبط اور دورانیہ کی تاریخ میں کوئی مثال نہیں ملتی۔

نظاریوں کے بارے میں جو قصے عیسائیوں کے ہاں مشہور ہیں ان کے لیے تاریخی ثبوت کی کمی ہے۔ ان کے ہاں زیادہ تر سنی سنائی باتیں رائج رہی ہیں۔ ان سے اس سوال کا جواب نہیں ملتا کہ وہ کیا چیز تھی جس کی بنا پر فدائین اپنی جان کی پرواہ کیے بغیر اتنے عزم صمیم کے ساتھ اپنا مفوضہ فریضہ سرانجام دیتے تھے۔ ابتدائی مآخذ میں جنت کے وعدے کا ذکر ملتا ہے۔ یہ بات اس اسلامی عقیدے سے مطابقت رکھتی ہے کہ جو اللہ کی راہ میں مارے جاتے ہیں وہ جہنم میں اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کیے بغیر سیدھے جنت میں جائیں گے۔ اس اندھی عقیدت کا بھی ذکر کیا جاتا ہے کہ جو فدائین کو اپنے تنظیمی آقا سے ہوتی تھی۔ یہ اندھی عقیدت پہاڑی قلعے کی تنہائیوں میں رہائش اور تربیت کے دوران پیدا کی جاتی تھی۔ اگر کسی فدائی کا آقا محض آزمائش کے لیے بھی اسے ایسا کرنے کو کہتا تو وہ بلندی سے چھلانگ لگا کر جان پر کھیل جانے سے بھی نہیں ہچکچاتا تھا۔

اس بنا پر کہ شہداء اور پیغمبروں کے لیے مخصوص بہشت کے باغ میں داخلے کے لیے آقا کی مدد درکار ہے، آقا سے فدائی کی کلی وفاداری اور فدائی کی جنت میں یقینی داخلے کی آرزو دونوں باہم مل کر (قتل بذریعہ خودکشی کا) محرک بن جاتی ہیں۔ علاوہ ازیں آقا نوجوان فدائیوں کی اس مقام مسرت یعنی بہشت میں داخلے کی خواہش سے مخصوص کام لینے کے لیے مشکوک قسم کے طریقے استعمال کرتا ہے۔ ایران میں سفر کے دوران مارکو پولو نے اس قسم کے قصے سنے تھے کہ پہاڑی قلعے میں ایک خوبصورت خفیہ باغ بنایا گیا

ہے جس میں ہر قسم کی عیش وعشرت فراہم کرنے کے ماہر لوگ مقرر کیے گئے ہیں۔ وقتاً فوقتاً فدائین کو حشیش یعنی بھنگ سے مدہوش کر کے اس باغ میں پہنچا دیا جاتا ہے، جسے فدائین جنت سمجھتے ہیں۔ کچھ عرصہ بعد انہیں حشیش سے مدہوش کر کے وہاں سے نکال دیا جاتا ہے۔ یوں وہ اس عیش وعشرت کے عادی ہو جاتے ہیں جس کے دوامی طور پر اور فوری حصول کے لیے وہ اپنی جان نثار کر کے مفوضہ قتل کر دیتے ہیں۔ وہ اپنے آقا کے بارے میں یہ یقین رکھتے ہیں کہ اسی کے حکم سے جنت کے دروازے کھل سکتے ہیں۔ اس قصے کا تانا بانا بہت رنگین اور پُر تاثیر ہے لیکن یہ فدائین کی حشیش استعمال کرنے کی عادت کی افواہوں کی مانند (جس کی بنا پر ان کا یہ نام پڑا) ثبوت سے عاری ہے۔

یہ قصے حقیقت ہیں یا محض ذہنی اختراع، اس سے ہمیں غرض نہیں۔ بہرصورت ان سے ایک اہم نکتہ سامنے آتا ہے۔ خودکشی پر منتج ہونے والے کام کی ذمہ داری سر لینے میں بہشت کے وعدے میں بڑی کشش ہونا قرین قیاس ہے تاہم خوفناک موت، معلوم دنیا کو چھوڑنے اور اس دنیا اور اگلی زندگی کے درمیان کی تاریک گلی میں داخل ہونے کے امکان کی ہیبت کو بے اثر کرنے کی خاطر مزید انعامات بھی ضروری ہوتے ہیں۔ ان لوگوں کی شعبدہ بازیوں سے، جو حشیشین کو تربیت دیتے تھے، اس عقیدے کی کچھ گرہ کشائی ہوتی ہے۔ فدائین کے کئی مواقع پر فریب آمیز جنت ارضی میں منتقل ہونے اور وہاں سے واپسی کے تجربے سے وہ زندگی سے موت کی حالت میں انتقال کے ذائقے سے تمثیلی طور پر آشنائی حاصل کر لیتے تھے۔ کیونکہ ایسے سابقہ تجربے کے بغیر، جس میں نامعلوم کی بیکراں اور مہیب وسعت کا پہلے ہی کئی دفعہ تجربہ کیا جا چکا ہوتا تھا، فدائی بننا ناقابل تصور حد تک ہیبت ناک محسوس ہوتا۔ حشیشین کو امید ہوتی تھی کہ وہ جانا پہچانا بہشت کا دربان (یعنی روحانی آقا) جو پہلے بھی سفر آخرت کو آسان بنانے میں نگران رہنما کا کردار ادا کرتا تھا وہ آخری بار بھی ایسا ہی کرے گا۔ بہشت کے عیش وعشرت کو حقیقت کا رنگ دے دینا ایک مفید ترکیب ہوتی تھی تاہم انتقال کے موقع کی ذہنی کربناک کیفیت کی شدت کو ختم کرنے کا کام ایک اعلیٰ ذہانت کا مظاہرہ ہوتا تھا۔

یوں حشیشین کے بارے میں قدیم قصوں سے پتہ چلتا ہے کہ قتل بذریعہ خودکشی کے قواعد کا مقصد موت کے خوف کا خاتمہ ہوتا تھا۔ مسلمانوں میں شہادت کی مختلف مثالوں میں یہی مقصد کارفرما نظر آتا ہے،

تا کہ موت اور بہشت میں داخلے کا وقفہ، جو کہ بڑی ہیبت اور خوف کا باعث ہے، سکڑ کر صفر بن جائے۔ اس وقفے یعنی عالم برزخ کے دورانیے کو کم کرنے سے متعلق روایتی مسلم تصور ایک اڑتے ہوئے سفید گھوڑے سے وابستہ ہے، جو شہید کو لے کر فوراً جنت میں پہنچا دیتا ہے۔ آج کل ''اڑن گھوڑے'' کا یہ تصور ختم ہو گیا ہے۔ فلسطینی ''خودکش بمباز'' سبز پرندے'' کی علامت پسند کرتے ہیں جسے جامنی رنگ کے پس منظر پر دکھایا جاتا ہے۔ پیغمبر اسلام کے قول کے مطابق ''یہ سبز پرندہ جنت کا پرندہ ہوتا ہے جو شہید کی روح کو فوراً اللہ میاں کے پاس پہنچا دیتا ہے''۔

ناصرہ حسن نے غزہ میں ۱۹۹۶ء اور ۱۹۹۹ء کے درمیانی عرصے میں ایسے لوگوں سے متعدد انٹرویو کیے جو شہادت کے مشن پر جانے کا انتظار کر رہے تھے یا جو اپنے مفوضہ فریضے میں کامیاب نہیں ہو سکے تھے، اور ان کے ساتھ بھی انٹرویو کیے تھے جو ایسے نوجوانوں کو تربیت دیتے ہیں۔ وہ تمام اس بات پر زور دیتے ہیں کہ شہادت کے خواہش مند کو لازماً بہشت کو توجہ کا مرکز بنانا ہوتا ہے، انہیں داخلی طور پر اس کا تخیل حاصل ہونا چاہیے اور اپنے بارے میں یہ محسوس کرنا چاہیے کہ وہ محمد [صلی اللہ علیہ وسلم] اور اللہ کے حضور حاضر ہیں۔ بالخصوص کارروائی سے پیشتر آخر چند دنوں میں انہیں لازماً فوری طور پر اس میں داخل ہونے پر توجہ مرکوز کرنی چاہیے۔ فوری انتقال کی رفتار میں سرعت پیدا کر کے زندگی کی حالت سے موت کی حالت میں تبادلے کے کرب پر فتح پانے کی تفصیل ایک ایسے شخص نے بیان کی ہے جو اپنے مشن کی انجام دہی سے پیشتر گرفتار ہو گیا تھا۔ وہ کہتا ہے ''(بہشت) بہت ہی نزدیک ہے، عین آنکھوں کے سامنے بس یوں سمجھیے کہ انگوٹھے کے نیچے پڑی ہوئی ہے۔ گویا دھماکا خیز مواد کے دوسری طرف''۔

ایران-عراق جنگ کے دوران شہیدوں کی سواری کے لیے یقیناً ایسے گھوڑے اور پرندے کم پڑ گئے ہوں گے، جب آیت اللہ خمینی نے ۱۲ سال کی عمر سے زائد لڑکوں کو، حتیٰ کہ والدین کی اجازت کے بغیر بھی، ورغلا کر فوج میں بھرتی کر لیا تھا۔ میدان جنگ میں ان (بچوں) نے سپاہیوں سے آگے آگے بھاگتے ہوئے بارودی سرنگوں کے دھماکے کر دیے اور ہزاروں کی تعداد میں مارے گئے۔ انہیں بلا تاخیر بہشت میں داخلے کے لیے تائیوان کی ساختہ پلاسٹک کی بنی چابیاں جاری کی گئی تھیں۔

فلپائن میں رسم حلف برائے خودکشی (Juramentado)

نسلی بنیادوں پر قتل بذریعہ خودکشی کی وارداتوں کی دوسری قسم وہ ہے جو فلپائن میں مسلم اقلیت میں پائی جاتی ہے۔ وہاں قتل بذریعہ خودکشی کی بہت منظم مشکل پائی جاتی ہے جس کے ساتھ ساتھ اس کی متضاد شکل یعنی خودکشی بذریعہ قتل بھی موجود ہے۔

سولھویں صدی عیسوی میں فلپائن میں اسلام تیزی سے پھیلا اور اس نے ہندومت و بدھ مت نیز دیگر مقامی مذاہب کی جگہ لے لی۔ لیکن جلد ہی ہسپانوی راج اور عیسائیت کے کیتھولک فرقے کی توسیع سے اشاعت اسلام کی رفتار میں کمی آ گئی۔ اور صرف جنوبی جزائر سولو (Sulu Archipelago) میں چند مختلف نسلوں کے قبائل دین اسلام سے وابستہ رہے۔ انہیں ہسپانیوں نے ”مورو“ کا نام دیا جنہوں نے تین سو سالہ ہسپانوی نوآبادیاتی راج کے دوران مختلف مقامات پر جتھے بنا کر مزاحمت جاری رکھی۔

فلپائنی مسلمانوں نے عیسائیوں کے خلاف جن سے وہ نفرت کرتے تھے دو قسم کے خودکش حملے شروع کر دیے۔ میدان جنگ میں ہسپانوی فوج سے لڑائی میں بعض آدمی رضاکارانہ طور پر اگلی صفوں میں تعیناتی کرواتے اور اندھا دھند دشمن کی صفوں میں گھس کر حملہ آور ہوتے اور بے جگری سے لڑتے رہتے حتیٰ کہ مارے جاتے۔ اس جہاد کی ایک اور شکل یہ تھی کوئی شخص تنہا ”کرس“ نامی خنجر سے یا بعض اوقات چھوٹے نیزے سے مسلح ہو کر کسی عیسائی بستی میں گھس جاتا اور جو کوئی بھی راستے میں آتا اس پر حملہ کر دیتا۔ بعض اوقات غیر عیسائی لوگوں، عورتوں اور بچوں کو چھوڑ دیا جاتا تھا۔ اس سے پیشتر کہ بالآخر کوئی اسے قتل کر دیتا اس کے زوردار اچانک اور اندھا دھند حملے سے کئی لوگ ڈھیر ہو چکے ہوتے۔ کبھی کبھار اس قسم کی مار دھاڑ کے لیے کئی لوگ پیشگی معاہدہ کر لیتے تھے۔

خودکش حملہ ایک قدیم عمل کا آخری جزو ہوتا تھا جسے مقامی زبان میں کئی ناموں سے پکارا جاتا تھا۔ ہسپانوی زبان میں اسے جیورامنٹاڈو (Juramentado) کا نام دیا جاتا تھا، جس کا مطلب ہے ”قسم کھا کر حلف اٹھانا“۔ جو شخص قسم کھا کر حلف اٹھاتا تھا، وہ پہلے اس کے لیے اپنے والدین سے اور بعد ازاں مقامی یا اعلیٰ تر صاحب اختیار ہستی سے اجازت لیتا تھا۔ اس کے بعد وہ اپنے ہتھیاروں کی طرف متوجہ ہوتا اور پھر رسمی تیاریوں کے ایک سلسلے میں مشغول ہو جاتا۔ اس میں طہارت، غسل اور دعا شامل ہوتی کہ یہی

میت کے دفن کرنے سے پہلے کیا جاتا ہے۔ یہ کام اس کی زندگی میں ہی کر لیا جاتا تھا کیونکہ مرنے کے بعد اس کی لاش کے ملنے کا امکان نہ ہوتا تھا۔ اس کی جسمانی طاقت اور قوت برداشت بڑھانے کی خاطر کچھ اور عمل بھی کیے جاتے تھے، جن میں تعویذ باندھنا، خوشبو لگانا، اس کے سر کی حجامت اور بھنویں اکھاڑ دینا، اور ذَکر کو اوپر کی طرف کس کر باندھ دینا شامل تھے۔

متعلقہ شخص کو قتل و غارت کے لیے درکار ضروری ساز و سامان مثلاً ہتھیاروں کے استعمال میں سہولت، تشدد کا رجحان اور مزعومہ ناانصافیوں کے ازالے کے لیے جوش و جذبہ، اسے اس کا تمدن فراہم کر دیتا تھا۔ تھامس کیفر نے ۱۹۷۰ء کی دہائی میں طاؤسغ نامی قبیلے میں رہ کر تحقیقی کام کیا تھا جو کہ سولو کے جزیروں میں رہنے والا ایک بڑا نسلی گروہ ہے۔ اس کی تحقیق کے مطابق چھوٹی سے چھوٹی چوری، کسی نازیبا جملے، تحقیر آمیز نظر سے دیکھنے یا وقت مقررہ پر قرض کی عدم ادائیگی پر، یعنی کسی بھی بات پر تشدد پھوٹ سکتا ہے۔ اور پھر جلد ہی مردوں میں قتل و غارت شروع ہو جاتی کیونکہ ان لوگوں کے معمول کے لباس میں گولیوں کی پیٹی، ایک رائفل اور تیز دھار ہتھیار شامل ہوتے ہیں۔ اگر کوئی شخص اپنی توہین کا بدلہ نہ لے تو یہ اس کے لیے باعث شرم بات ہوتی ہے اور ہر موت کا انتقام لیا جانا ضروری سمجھا جاتا ہے۔

قسم کھا کر حلف اٹھانے (Juramintado) کے بارے میں رپورٹیں بہت کم ہیں اور وہ بنیادی باتوں تک محدود ہیں۔ ان میں رسموں کے تسلسل اور ترکیبی عقائد جن کی جڑیں راسخ العقیدہ اسلام میں قائم ہیں اور جن میں مقامی تصورات کا امتزاج ہو گیا ہے، کے لحاظ سے اتفاق پایا جاتا ہے۔ ان کے عقیدے کی رُو سے قسم کھا کر حلف اٹھا کر شہادت پانے والا شخص سفید اڑن گھوڑے پر بیٹھ کر بہشت میں پہنچ جاتا ہے اور اسے ماضی کے گناہوں کے لیے جہنم میں رہ کر کفارہ ادا کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہ بات اس عقیدے پر مبنی ہوتی ہے کہ وہ ''معصوم موت'' مرا ہوتا ہے، جس کا مطلب باطل پرست دشمن کے ہاتھوں موت ہے۔ چونکہ ہسپانوی جبری مذہب تبدیل کرواتے تھے، اس لیے وہی باطل پرست دشمن تصور کیے جاتے تھے۔ جب ایک دفعہ ۱۸۹۸ء میں ہسپانیوں کو شکست ہو گئی اس کے بعد نہ تو امریکی اور نہ ہی فلپائنی دشمنان اسلام کے کردار میں نظر آئے اور حلف برائے خودکشی کی کثرت وقوع میں کمی آ گئی۔ بعد میں جا کر کچھ مدت کے لیے جاپانی اور ماضی تقریب میں اکا دکا فلپائنی سپاہی اس کا نشانہ بنے۔

حلف برائے خودکشی ساخت کے لحاظ سے کئی پہلوؤں میں حشیشین کی کارروائیوں سے مختلف ہے۔ اسے اوپر سے کوئی ایسا مقتدر ترین رہبر ترتیب نہیں دیتا جس کی تنظیم کے بھرتی شدہ پیروکار اس سے بلاشرکت غیرے وفاداری کے رشتے میں جکڑے ہوئے ہوں۔ وہ پیروکار جن کی تنہائی میں اس وقت تک تربیت اور تلقین عقیدہ جاری رہتی ہو جب تک کہ انہیں کوئی مشن تفویض نہیں ہو جاتا۔ جبکہ خودکشی کا حلف اٹھانے والا شخص کسی گاؤں میں عام سی زندگی بسر کرتے ہوئے اپنی مرضی سے اور خود منتخب کردہ وقت پر اس کام کے لیے نکل کھڑا ہوتا ہے۔ اگرچہ اس کی کارروائی غیر معمولی نوعیت کی ہوتی ہے، تاہم وہ سب سے الگ تھلگ کوئی ایسا مصروفِ عمل شخص نہیں ہوتا جو اپنی برادری سے بالکل ہی لاتعلق ہو۔ اپنی جدوجہد کی راہ میں اس کا پہلا قدم اپنے والدین، میر دیہہ، قریبی رشتہ داروں اور بعض اوقات سلطان کے پاس حاضری دینا ہوتا ہے، سلطان کے پاس اس لیے کہ وہ ہسپانوی راج کے دوران مجمع الجزائر سولو میں مسلمانوں کی برادری کا بیک وقت انتظامی اور مذہبی سربراہ ہوتا تھا۔ وہ ان سب کے سامنے الگ الگ اپنے ارادے کا اظہار کرتا۔ وہ اس کو اس کام کی اجازت دیتے کیونکہ محلف جو کام کرنے جا رہا ہوتا وہی کام وہ خود، ان کا کوئی بیٹا، کوئی رشتہ دار، کوئی دوسرا دینی بھائی یا کوئی بھی مسلمان کرنے کو تیار ہوتا تھا۔

حلف برائے خودکشی کی جن شکلوں کا اوپر ذکر کیا گیا ہے — یعنی جنگ یا تنہا ایک شخص یا کئی اشخاص کا مل کر اچانک شدید حملہ — یہ تمام جہاد کی کارروائیاں شمار ہوتی ہیں۔ ان کارروائیوں میں جان قربان کر دینے پر اصرار اپنی انتہا پر پہنچا ہوتا ہے۔ اس کام کی مزید دو ایسی شکلیں بھی ہیں جن میں اس نمونے سے انحراف پایا جاتا ہے۔ وہ انحراف محرک کے لحاظ سے ہوتا ہے، رسمی تیاری کے طریق کار اور عمل درآمد سے نہیں۔ کوئی ایسا شخص جس سے کوئی گناہ کبیرہ سرزد ہوا ہو اور اسے سزا تجویز کی جا چکی ہو، وہ موت کی سزا پانے کی بجائے خود رضاکارانہ طور پر یا میر دیہہ یا سلطان کی ترغیب پر اپنے آپ کو حلف برائے خودکشی کے لیے پیش کر سکتا ہے۔ حلف برائے خودکشی کی دیگر شکلوں کے مقابلے میں اس شکل میں اس قسم کی رضامندی غائب ہے کیونکہ سزا یافتہ مجرم کو صرف یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ موت کی دو صورتوں میں سے ایک کا انتخاب کر لے۔

حلف برائے خودکشی کی دوسری شکل میں قتل بذریعہ خودکشی کی الٹ صورت نظر آتی ہے۔ ایک ایسا

شخص جو اس بنا پر اپنی زندگی کا خاتمہ کرنا چاہتا ہو کہ چونکہ اس کی تحقیر کی گئی ہے، یا اپنی شادی سے ناخوش ہے یا کسی اور وجہ سے رنجیدہ ہے، حلف برائے خودکشی اٹھا سکتا ہے۔ اسلام میں خودکشی کی ممانعت ہے اور اس فعل کے مرتکب شخص کا ٹھکانہ جہنم کو قرار دیا گیا ہے۔ تاہم فلپائنی مسلمان اس فعل قبیح کو اپنی زندگی کے خاتمے کے متذکرہ بالا عسکری طریقے کے مترادف نہیں سمجھتے۔

اپنی خودکشی کو جہاد کے لبادے میں چھپانے سے نہ صرف اس پر لگا فعل شنیع ہونے کا دھبا دھل جاتا ہے بلکہ وہ قابل تحسین اور آخرت میں قابل جزا قرار پاتا ہے۔ دوسری ثقافتوں کی مانند جن میں اس قسم کی ''نقاب پوش خودکشی'' کی اجازت ہے فلپائنی مسلمانوں میں مرنے کی خواہش پنہاں نہیں ہوتی۔ یہ ایک مسلمہ عنصر ہوتا ہے جس سے اس فعل کی قدر و قیمت میں کمی نہیں ہوتی اگرچہ وہ شخص جو خودکشی بذریعہ قتل کا مرتکب ہوتا ہے جہاد کے ذرائع اور مقاصد کو الٹ دیتا ہے۔ ان میں سے بعض کو مایوسی سے نجات پانے کی خواہش اس فعل کے ارتکاب کی حد تک دھکیل دیتی ہے، دوسروں کو انتقال، عدل یا جرأت اس فعل پر اکساتی ہے۔ تاہم حلف برائے خودکشی کی رسم کی تفہیم کے لیے ہمیں داخلی تحریک کے پیچھے اس مرحلے پر نظر ڈالنا ہوگی جو ایسا حلف لینے والوں کو اس وقت درپیش ہوتا ہے جب ان کا خودکشی کرنے کا فیصلہ باطن سے ظاہر کی حد عبور کر لیتا ہے۔ والدین اور رہنماؤں پر اس فیصلے کا انکشاف اور ان کی رسمی منظوری سے داخلی عزم دنیا کے سامنے اعلان کی شکل اختیار کر لیتا ہے پھر اس اعلان پر قسم یا حلف کی مہر ثبت ہو جاتی ہے۔

جو شخص حلف برائے خودکشی اٹھاتا ہے وہ اپنے حلف کا پابند ہو جاتا ہے۔ اب جس بات کا خدا کی قسم کھا کر عہد کیا گیا ہے اس سے ہرگز پیچھے نہیں ہٹا جا سکتا۔ اپنی جان کی قربانی جو قسم کھانے کے وقت تک رضاکارانہ ہوتی ہے قسم کھانے پر فرضِ عین بن جاتی ہے۔ فلسطینی خودکش بمباز قرآن (کریم) پر قسم کھاتے ہیں اور ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کے جہازوں کے اغوا کنندگان کو ہدایت کی گئی تھی کہ آخری دن باہمی پیمان کے ذریعے اس بات کی تصدیق کریں گے کہ وہ اپنے مشن کی انجام دہی میں اپنی جانوں پر کھیل جائیں گے۔

قسم کے ذریعے پیمان کنندہ شخص اس کارنامے کے ساتھ جکڑ بند ہو جاتا ہے جس کا اس نے عہد کیا ہوتا ہے۔ حقیقت میں یہ کارنامہ کیا ہوتا ہے؟ خدمت اسلام کی خاطر اسے دشمنانِ اسلام سے جنگ کرنا ہوتی ہے اور انہیں زیادہ سے زیادہ تعداد میں مارنا ہوتا ہے۔ شہادت کا رتبہ پانے کے لیے اسے دشمنوں کے

ہاتھوں مارا جانا ہوتا ہے۔ یوں مرنا اور مارنا ایک ہی مقصد میں مجتمع ہو جاتے ہیں۔ ان دونوں میں سے کوئی ایک تنہا مقصد ہے اور نہ ہی دوسرے کے لیے ذریعہ ہے۔ اپنے مقصد کی کامیابی کے وہ جتنا قریب ہوتا جاتا ہے اتنا ہی اپنی ذات کی اور اپنے دشمن کی ہلاکت استحکام پکڑتی جاتی ہے۔ وہ جوں جوں اپنے جسم کو جہاد کے لیے جادوئی طور پر مضبوط بناتا ہے اور اسے رسمی طور پر تدفین کے لیے تیار کرتا ہے، رسمی تیاریوں کے پورے عرصے کے دوران وہ اپنی اور اپنے دشمنوں کی اموات کی یاد تازہ کرتا رہتا ہے۔ مرنے مارنے کی ایک آرزو سیل رواں کی طرح اسے دشمن کے علاقے میں بہائے لیے چلی جاتی ہے۔ یہ اس منظر پر منتج ہوتی ہے جسے ذیل میں بیان کیا گیا ہے، جس سے ان کے حتمی امتزاج کا اظہار ہوتا ہے۔ ''چشم دید گواہوں نے مجھے متعدد بار بتایا کہ انہوں نے محلفین برائے خودکشی کو دیکھا کہ جب ان پر سنگین کا وار کیا جاتا ہے تو وہ رائفل کی نالی کو مضبوطی سے پکڑ کر سنگین کی انی کو اپنے جسم میں زیادہ گہرا گھونپ لیتے ہیں تا کہ حملہ آور دشمن سپاہی اپنے اتنا قریب لا سکیں تا کہ اس پر ضرب لگا سکیں اور پھر اسے مار گراتے ہیں''۔

حلف برائے خودکشی نے خودکشی اور قتل کے فرق کو مٹا دیا ہے۔ وحدت مقصد متعلقہ شخص کو آگے بڑھنے پر مجبور کرتی ہے، اور اس کی توجہ کو اس تشدد میں کود پڑنے پر مرتکز کر دیتی ہے جس کا ارتکاب کرنا اس کا مقصد ہوتا ہے، یہ اس کے قاتلانہ حملے کے شکار اور اس کی اپنی قربانی کی خواہش کو ایک دوسرے میں مدغم کر دیتی ہے۔ جدید تکنیکیات نے وہ اوزار مہیا کر دیے ہیں جو اس مہلک ادغام کو ہیبت ناک شکل عطا کر دیتے ہیں۔ اس کی مثالیں ہیں وہ انسانی بم بنی لڑکی ہے جو اپنے دشمن کے قریب پہنچتے پہنچتے اپنے آپ کو دھماکے سے اڑا دیتی ہے اور ایندھن سے بھرے جہاز کے پائلٹ کی نشست پر بیٹھا وہ نوجوان جو انسانی جانوں سے پُر ٹاور سے اپنے جہاز کو ٹکرا دیتا ہے۔

کربلا کے مقام پر شہادت

حلف برائے خودکشی میں خودکشی اور قتل کی یکجائی اسلامی شہادت کے دو بنیادی عناصر، یعنی ابتلا اور جنگ کے درمیان اساسی ربط قائم کرتی ہے۔ تیسرے اور آخری واقعے میں شہادت کے شیعی تضمن یا تصور کو اس کی بنیادی کہانی کے ذریعے بیان کیا گیا ہے۔ یہ ہے کربلا میں نواسۂ رسول [صلی اللہ علیہ وسلم] حسین

[رضی اللہ تعالیٰ عنہ] کا قتل۔ ماضی کی تمثالی ہستیوں کے ذریعے حال میں زندہ رہنے کے رواج نے کہانی اور اس کے پیغام کی مستقل موزونیت کو آسان بنا دیا ہے۔

جو واقعات کربلا کے سانحے کا پیش خیمہ بنے وہ یوں ہیں: محمد [صلی اللہ علیہ وسلم] کا انتقال سن ۶۳۲ء میں ہوا۔ آپ نے اپنے پیچھے کوئی اولاد نرینہ نہ چھوڑی تھی۔ آپ کی وفات کے بعد آپ کی روحانی اور سیاسی وراثت وجہ نزاع بن گئی۔ فریقین نزاع نے اپنے حق کے دعوے کی بنیاد یا تو پیغمبر (اسلامؐ) سے قریبی رشتے داری پر رکھی اور یا پھر شہر مدینہ کے سربرآوردہ خاندانوں سے تعلقات پر، جہاں سے محمد [صلی اللہ علیہ وسلم] نے عرب کو سیاسی اور مذہبی طور پر متحد کیا تھا۔ بعد کے پانچ عشروں میں محمد [صلی اللہ علیہ وسلم] کے پانچ جانشینوں کو قتل کیا گیا، مسلمانوں کی افواج ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہوئیں، اور مشرق وسطی کے بیشتر علاقوں پر عربوں کے پھیلاؤ کی اولین بڑی لہر کے ساتھ علاقائی مفادات کی گروہ بندی سرایت کر گئی۔

ان واقعات کے رونما ہونے کے عمل میں سب سے اہم عنصر چوتھے جانشین یا خلیفہ علی [رضی اللہ عنہ] کی ذات تھی۔ بہت سے لوگوں کی نظر میں پیغمبر [صلی اللہ علیہ وسلم] نے متعدد سماجی تعلقات کی بنا پر علی [رضی اللہ عنہ] جو کہ ان کے قبیلے کی متوازی شاخ سے عم زاد تھے، کو بیٹوں کی طرح پالا پوسا تھا اور ان سے اپنی سب سے پیاری بیٹی فاطمہ [رضی اللہ عنہا] کا نکاح کیا تھا۔ علی [رضی اللہ عنہ] کو ان کی خلافت کے پانچویں سال میں قتل کر دیا گیا۔ خلافت ایک دوسرے قبیلے بنو امیہ میں منتقل ہو گئی اور خلافت کا انحصار انتخاب کی بجائے وراثت قرار پایا۔ تقریباً دو عشروں بعد علی [رضی اللہ عنہ] کے دوسرے بیٹے حسین [رضی اللہ عنہ] نے اس صورت حال کے خلاف آواز بلند کی، اور ۶۸۰ء میں (اہل کوفہ کی) حمایت کے عیارانہ جھوٹے وعدے کی بنا پر عراق میں کربلا (لفظی مطلب: مقام کرب) کے مقام پر ۷۲ افراد پر مشتمل ان کے قافلے کے ساتھ ان کو قتل کر دیا گیا۔

حسین [رضی اللہ عنہ] کے فریب کارانہ قتل نے سنیوں اور شیعوں کے درمیان تفرقہ حتمی طور پر پختہ کر دیا۔ سنی بنو امیہ کی خلافت کو تسلیم کرتے تھے جبکہ شیعہ (شیعان علی کا مخفف) کا اصرار تھا کہ صحیح امیر پیغمبر [صلی اللہ علیہ وسلم] کے قریبی رشتہ داروں میں سے ہونا چاہیے۔ امیر کے اوصاف، مابعد الطبیعاتی مسلمات،

اخلاقیاتی تقاضوں اور مذہبی عقائد اور معاشرتی طور طریقوں کے کئی دیگر پہلوؤں کے بارے میں اختلافات نے دونوں گروہوں میں مزید بُعد پیدا کر دیا جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ پھیلتا اور گہرا ہوتا گیا۔ سنی اکثریت کے قانون میں نظم وضبط کو سب سے زیادہ فوقیت حاصل تھی، اور ان کی نظر میں سرکشی ہی سب سے اہم خطرہ تھا جس کا فرو کرنا ضروری تھا۔ شیعہ جو اقلیت میں تھے، حکمرانی کا سب سے بڑا فریضہ عدل کو قرار دیتے تھے اور استبداد کو سب سے بڑا دشمن گردانتے تھے جس کا مقابلہ کرنا ضروری ہے۔

کربلا کی حکایت شہادت کا احاطہ کرتی ہے، نیز یہ شیعہ مزاج کا نمایاں عنصر ہے اور اس کے ترجمانوں کو تین موضوع مہیا کرتی ہے: حسین [رضی اللہ عنہ] کا ابتلا، اس کی ارادیت اور اس کا جنگی منظرنامہ۔ حسین [رضی اللہ عنہ] کے لمحہ بہ لمحہ دردناک انجام کے بیان میں ہر تفصیل کے سیر حاصل ذکر سے ان کا رنج وغم نمایاں ہو کر سامنے آ جاتا ہے: انہوں نے اپنی گود میں اٹھائے شیر خوار بیٹے کے لیے پانی حاصل کرنے کی کیسے وکالت کی، جس کو پانی دینے کے بجائے تیر سے چھلنی کر دیا گیا۔ انہوں نے چند نفوس کے ساتھ دشمن کی کثیر تعداد کے خلاف نام نہاد طویل جنگ میں اپنے تمام ساتھیوں کے قتل کے بعد اپنے قاتلین کا کیسے سامنا کیا، ۷۰ تیروں سے جسم چھلنی ہونے کے بعد انہوں نے کیسے جان، جان آفریں کے سپرد کی، اموی خلیفہ کے پاس لے جاتے ہوئے راستے میں کیسے ان کے دھڑ سے علیحدہ کیے ہوئے سر کو پکڑ کر صوبائی گورنر نے منہ پر چھڑیاں ماریں۔

شیعہ روایات میں دعویٰ کیا جاتا ہے کہ حسین [رضی اللہ عنہ] نے شہادت اور اپنے انجام کو ان کی کل تفصیلات کے پورے علم کے ساتھ اپنی مرضی سے منتخب کیا تھا اور سیاست اور وراثت سے ماوریٰ ایک خاص مقصد کے تحت ایسا کیا تھا۔ (شیعہ سمجھتے ہیں کہ) اموی عہد حکومت میں اسلام کی سمت اقتدار اور دولت کی طرف پھر گئی تھی، اور بدعنوانی اور جبر کے در کھل گئے تھے۔ حسین [رضی اللہ عنہ] کا اپنی ابتلا اور موت گلے لگانے کا مقصد لوگوں کو بیدار کرنے کے لیے پکارنا اور مومنین کو آسودہ خاطری سے جھنجھوڑ کر جگانا تھا تاکہ وہ اپنے ضمیر کے مطابق آواز بلند کریں۔ ان کی قربانی کی غرض وغایت انہیں دوبارہ انصاف کی راہ پر لگانا اور اسلامی معاشرے کا دوبارہ قیام تھا۔

آخری بات یہ ہے کہ حسین [رضی اللہ عنہ] کی شہادت اس میدان جنگ میں ہوئی جہاں وہ برائی کی

طاقتوں کے خلاف لڑے۔ انہوں نے تھپڑ کے لیے دوسرا گال آگے نہیں کیا، انہوں نے اپنے حامیوں کو دشمن پر ٹوٹ پڑنے سے نہیں روکا۔ مرثیہ نگاری میں، جس کے ذریعے کربلا کے قصے کے ہر انچ پر خوبصورت نقش کاری کی گئی ہے، ہمیں بہ تاکید بتایا جاتا ہے کہ حسین [رضی اللہ عنہ] ایک ہیبت ناک جنگجو تھے جن کو کبھی بھی شکست نہیں دی جا سکتی تھی۔ تآنکہ انہوں نے خود مزاحمت سے گریز کا فیصلہ نہ کر لیا تا کہ ان کی شہادت پایہ تکمیل کو پہنچ سکے۔

شیعوں نے بطور کفارہ برداشت کی ہوئی ابتلا اور ناانصافی کے خلاف لڑائی کے قصے کو بار بار بیان کر کے گویا اسے ستاروں کے ایک ایسے جھرمٹ کی شکل دے دی ہے جو مومنوں کے لیے راہنمائی، دعوت اور ترغیب کا باعث ہے۔ مائیکل فشر نے اسے کربلا کے علامتی نمونہ کا نام دیا ہے۔ کربلا کی یاد شیعوں کی شناخت اور (ان کے خیال میں) وجہ احترام بن گئی ہے۔ (ان کی نظر میں) یہ ایک مقدس زخم ہے، جسے شروع سے اب تک کھلا رکھا گیا ہے۔ ایک ایسے کنویں کی مانند جس سے شناخت اور مقصد کا شعور حاصل ہوتا ہے۔ اس قصے کی قائم رہنے والی قوت بار بار کے ذکر اور شناخت سے حاصل ہوتی ہے۔

ہر سال پورے ماہ محرم میں، جس میں یوم عاشورہ یعنی وہ دن آتا ہے جس دن حسین [رضی اللہ عنہ] کو قتل کیا گیا تھا، کربلا کے واقعات کی بار بار علامتی اور رسمی تمثیل دہرائی جاتی ہے۔ اس میں شیعوں کے گھروں میں اشعار کا پڑھے جانا، امام باڑوں میں ذکر کے واقعات کی ڈرامے کی شکل میں مخصوص طرز سے پیش کاری، اور سڑکوں اور گلیوں میں حسین [رضی اللہ عنہ] کے مقبرے کی شبیہ کے تعزیوں کے جلوس جن کے ساتھ اکثر ماتم کرنے والے ہوتے ہیں جو خنجروں سے اپنے ماتھوں کو زخمی کر لیتے ہیں --- شامل ہوتے ہیں۔ ان رسومات کے نتیجے میں جو کیفیت پیدا ہوتی ہے وہ بعد میں بھی جاری رہتی ہے۔ شیعوں میں یہ قول مشہور ہے کہ ایک (شیعہ) شخص کو ایسے زندہ رہنا چاہیے جیسے کہ ہر دن یوم عاشورہ ہے اور ہر جگہ کربلا ہے''۔

محرم کے واقعات کے دوران، ماضی و حال ایک دوسرے میں مدغم ہو جاتے ہیں۔ یہ دونوں زمانے ان کے ماننے والوں کی ہستیوں میں —— ان کے ذہنوں میں اور ان کے گوشت پوست میں —— یکجا ہو جاتے ہیں۔ محرم کے جلوس کے شرکاء، حسین [رضی اللہ عنہ] کی تکلیف کی انتہا کو خود اپنے جسموں پر محسوس

اور برداشت کرنے کی آرزو کرتے ہیں، اور ساتھ ہی ساتھ ان پر ان لوگوں سے، جنہوں نے یہ تکلیف پہنچائی، شدید اور جائز غضب ناکی کے ساتھ انتقام لینے کی دھن سوار ہوتی ہے۔ جوں جوں (ماتمی) جلوس آگے بڑھتا ہے رنج وغم، گریہ وزاری اور کرب ناکی آنکھوں اور کانوں میں سرایت کرتی جاتی ہے۔ بدلے کا ہیجان خیز رجحان جیسے ان کے اندر جوش مار رہا ہوتا ہے اور وہ ذرا سے اشتعال پر لڑنے مرنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ ہندوستانی مصنف وکرم سیٹھ نے اس کیفیت اور اس کے فوری پھٹ پڑنے کا نقشہ کھینچا ہے۔ اس نے اپنے ناول ''ایک موزوں لڑکا'' جو کہ اوائل ۱۹۵۰ء کے دور کے بھارت کے منظر نامے میں لکھا گیا ہے، میں دکھایا گیا ہے کہ ایک حسینی ماتمی جلوس کا اچانک جشن منانے والے راما جلوس سے ٹکراؤ ہو گیا اور فوراً ہی مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان دلوں میں بھری نفرت ایک لڑائی کی صورت میں پھٹ پڑی اور خون خرابہ ہو گیا۔

آیت اللہ خمینی کی تندخو رہبری کے تحت ۱۹۷۹ء کے ایرانی انقلاب اور اس کے نتیجے میں قائم شدہ حکومت نے اس علامتی امتزاج کا بھرپور فائدہ اٹھایا۔ شاہ کے خلاف جدوجہد کو حسین [رضی اللہ عنہ] اور اموی حکومت کے درمیان جنگ کے روپ میں پیش کیا۔ شاہ کے خلاف جلوس محرم کے ماتمی جلوس بن گئے۔ سیاسی جلوسوں نے ماتمی جلوسوں کی شکل اختیار کر لی اور عاشورہ کے دن تہران میں ایک لاکھ نفوس جلوس میں شامل ہوئے، اور اس کے صرف دو ماہ بعد خمینی فاتح بن کر ایران میں داخل ہوا۔

خمینی اپنے اصل منصوبے یعنی ایرانی انقلاب کو عالم اسلام میں برآمد کرنے میں تو کامیاب نہ ہو سکا تاہم اس کی طرف سے شہادت کے ساتھ خودکشی کی پیوندکاری عراق کے خلاف جنگ میں تکمیل پذیر ہوئی اور جسے حزب اللہ نے دہشت گردی بذریعہ خودکشی کی وساطت سے نئے اوزاروں سے مزین کیا اور یہ وسیع پیمانے پر پھیل گئی۔ ۱۹۸۰ء کے عشرے میں شیعہ عسکریت پسند نے دھماکا خیز مواد سے بھرے اپنے ٹرک امریکی اور اسرائیلی تنصیبات سے ٹکرائے، بعدازاں اس سے فلسطینی حماس کی کارروائیوں کو تحریک ملی۔

خاتمہ کلام

مندرجہ بالا تین تاریخی واقعات میں سامنے آنے والی قتل بذریعہ خودکشی میں علامتی تشکیلات کے

مابین ایک خصوصیت مشترکہ طور پر پائی جاتی ہے وہ یہ کہ ان میں ان اختلافات کو محو کرنے کی کوشش کی جاتی ہے جو دن کی روشنی میں اہم ہوتے ہیں ـــــ یعنی خود اپنی ہلاکت اور دوسروں کی ہلاکت کے مابین، روانگی اور آمد کے مابین اور ماضی، حال اور مستقبل کے مابین اختلافات۔ قربانی اور قربان ہونے والا شخص حلف برائے خودکشی کو تقدیس عطا کرتے ہیں۔ خودکش بمباز کا انگوٹھا جب دھماکہ خیز مادے کو چلانے کے لیے بٹن دباتا ہے اسے اسی وقت بہشت میں پہنچا دیتا ہے۔ حشیشین لڑکی نے تو پہلے ہی اپنے مستقبل کی جھلک دیکھ رکھی ہوتی ہے۔ یہ محفوظ طریقے سے جانا پہچانا ہوتا ہے۔ ان لوگوں کے لیے جو جرأت سے بھرپور ماضی میں ڈوبے ہوتے ہیں، موجودہ افعال اس ماضی سے صواب اور قوت حاصل کرتے ہیں۔

زندگی اور موت کے درمیانی وقفے کی عام طور پر وقوع پذیر ہونے والی اذیت ناک ذہنی وقلبی کیفیت پر قابو پانا صرف مسلم دہشت گردوں کا مسئلہ نہیں ہے، بلکہ موجودہ ہزاریے کی دیگر تحریکات، فرقوں اور بعض خیالی جنت کے حصول میں مصروف کار معاشروں کا بھی مسئلہ ہے۔ اس کیفیت پر قابو پانے کے طریقے ان سب میں مختلف ہیں۔

(ہر سہ واقعات میں سے) ہر ایک تاریخی واقعے کا مختلف اور مخصوص ایجنڈا تھا۔ حشیشین انتقال کی ذہنی اضطرابی کیفیت، اس زندگی اور اگلی زندگی کے درمیان خلا کو مختصر کر کے ختم کرتے تھے۔ محلف برائے خودکشی، قتل اور خودکشی کو قربانی کے واحد فعل میں ڈھال کر ان کو ملحدانہ اخلاقی اور طبعی تعبیرات سے پاک کرتے تھے۔

(شیعہ اور سنی) کارروائیاں کرنے والوں کو کربلا کے واقعات اور محمد [صلی اللہ علیہ وسلم] کے حملوں کا ذکر اخلاقی شکوک وشبہات اور خانہ نشینی کی کشش سے بچاتا ہے۔

عمومی ایجنڈا اس اساسی فرق کو واضح کرتا ہے جو صالح اقلیت اور بے بصیرت، ناتوان یا بدقماش ہجوم کے مابین پایا جاتا ہے۔ اس کا تعلق خیر وشر کے درمیان بہت مہین خط کھینچنے سے ہے۔ ان لوگوں کے لیے جو قتل بذریعہ خودکشی پر عمل درآمد کرتے ہیں، استثنائی پارسائی کا تصور یا زیر تربیت ولی ہونے کا تصور، متعلقہ تحریک کے معمول میں پڑے شگاف کو پُر کر دیتا ہے۔ وہ ارکان جن کی محض اپنی ذات کی قربانی کی بنا پر قدر وقیمت ہوتی ہے ان کو نہ صرف بدقماش لوگوں پر فوقیت کے احساس کی ضرورت ہے بلکہ ان کو اپنی موت